غزل گوئی

غزل کو بعض نقادوں نے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اردو شاعری کے سرمائے کا تجزیہ کریں تو اس صنف کی مرکزیت تسلیم کرنے میں کوئی کلام نہیں۔ انیسویں صدی تک اردو شاعری کا کم از کم پنچانوے فی صد حصّہ غزل کے حوالے رہا۔ بیسویں صدی میں نثر اور شاعری کی مختلف صنفوں کے باوجود غزل کا سرمایہ نصف سے کم معلوم نہیں ہوگا۔ ہر دور میں غزل گو شعرا اپنے عہد میں امتیاز حاصل کرتے رہے اور شاید ہی کبھی ایسی صورت پیدا ہوئی ہو کہ اپنے زمانے کا سب سے اہم شاعر غزل گو نہ ہو۔ ہماری مجلسی زندگی پر غزل کے اشعار اس طرح سے حاوی رہے ہیں کہ اکثر و بیش تر غزل کے سرمائے کو ہی پوری اردو شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو اگر کسی تہذیب کا نام ہے تو غزل واقعتاً اس کی روح ہے۔ اردو کے دو عظیم شعرا ــــ میر اور غالبؔ بھی غزل کے شاعر ہوئے۔ غزل کی اہمیت کے تعلق سے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دکن کے ابتدائی شعرا سے لے کر آج تک تمام قابلِ ذکر شعرا نے اس صنف کو اپنی تخلیقی صلاحیت اور تکنیکی ہنر مندی کا میدانِ اوّل تسلیم کیا۔ میراجی جیسے نظم نگار کے کلیات میں سو سے زیادہ غزلوں کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ غزل کا کوئی جادو ہے جو اردو شاعری کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔

صنفی اعتبار سے غزل کا دائرہ کچھ خاص حدود سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ صنف قصیدے کی تشبیب سے علاحدہ کی گئی اور اس کا آزادانہ نام غزل ہے۔ جیسے تشبیب میں کسی موضوع کی قید نہیں تھی، وہ آزادی غزل گو شاعر کے نصیب میں بھی ہے۔ ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا لازم ہے۔ قصیدے کی روایت کی اِن دو مرحلوں میں تابع داری کے بعد غزل کا شاعر قصیدے سے اس اعتبار سے الگ ہو جاتا ہے کہ اسے ہر شعر میں ایک نئے مضمون کی داغ بیل رکھنی ہے۔ عہدِ قدیم میں یہ لازم کر دیا گیا کہ ایک شعر سے دوسرے شعر میں کسی قیمت پر کوئی معنوی ربط نہیں ہو۔ اب اگر کسی دو شعر میں معنوی تعلّق پیدا ہو گیا تو شاعر کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ''ق'' لکھ کر اشعار کے قطع بند ہونے کا اعلان کرے۔ غزل کی تعریف میں ایک اور بات تقریباً لازم مانی گئی کہ چاہے جو صورت بنے لیکن غزل کا شاعر عاشقانہ گفتگو ضرور کرے گا۔ جس کے سبب عشق و عاشقی کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ غزل ہوگئی۔ یہ سلسلہ حالات اور تصوّر کے بدلنے کے باوجود اب تک قائم ہے۔ اسی لیے غزل کا اصطلاحی معنیٰ عورتوں سے باتیں کرنا یا کلام میں عورتوں سے متعلق موضوع کو شامل مانا گیا۔

ہیئت کے اعتبار سے غزل مشکل صنف نہیں۔ اگر آپ کے پاس پانچ سات قوافی ہیں تو موزونیِ طبع کے سہارے ایک غزل تیار ہو سکتی ہے۔ مطلع میں دو قافیے اور پھر ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک ایک قافیہ استعمال میں آئے گا۔ ہر شعر

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

میں موضوعات بدل جاتے ہیں، اس لیے مختلف قوافی میں معنوی التزام کی کوئی قید بھی نہیں۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ اکثر نو آموز شعرا اپنا سفر غزل گوئی سے شروع کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے یہ مطلب برآمد نہیں کیا جانا چاہیے کہ غزل بے حد سادہ اور آسان صنف ہے۔ اس نے صرف نو آموزوں کو متوجہ نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے بہترین اور قادر الکلام شعرا کو بھی اُسی طرح اپنے حصار میں لیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اب یہ عام خیال ہے کہ غزل میں مبتدی اور بزرگ دونوں طرح کے شعرا کے لیے کشش کے اسباب موجود ہیں۔ مختلف شعرا کی مثالوں سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ تخلیقی جلال کے عروج پر شاعر کو پھر سے غزل کی یاد آجاتی ہے۔ مشق کی پختگی اور مطالعۂ کائنات کی ہمہ گیری اور گہرائی کے ساتھ ہی صنف غزل سے شعرا کا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ سعدی، حافظ اور امیر خسرو کے ساتھ ساتھ اقبال کی مثال سامنے رکھی جائے تو یہ یقین ہوجائے گا کہ شعرا اپنے فن کے عروج پر کس طرح غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔

دکنی عہد میں مثنویوں کا سرمایہ ہر لحاظ سے وقیع ہے لیکن اردو شاعری کا یہ ابتدائی زمانہ غزلوں سے خالی نہیں۔ قلی قطب شاہ، ملا وجہی، نصرتی، میر بلاقی، فیروز جیسے شعرا کے دواوین میں اچھی خاصی تعداد میں غزلیں موجود ہیں۔ سترھویں صدی کے اواخر سے قبل تک دکنی غزلوں کا سرمایہ اپنی مخصوص افتادِ طبع، نئے لسانی تجربے اور موضوعات کی سطح پر ایک اشتراک کے سبب اپنی شناخت رکھتا ہے۔ لیکن دکنی غزل کو وہ شناخت نامہ جسے تاریخ کا اعتبار حاصل ہوا، اس کے لیے اردو ادب کو سترھویں صدی کے آخری دور تک منتظر رہنا پڑا۔ ولی اور بعد میں سراج اورنگ آبادی ارضِ دکن سے ابھرنے والے ایسے شعرا ہیں جن کی غزل گوئی نہ صرف دکنی شاعری کے لیے تاج کا درجہ رکھتی ہے بلکہ یہ ایسے شعرا ہیں جنھیں دہلی کی اردو شاعری کو نئے سرے سے بنانے سنوارنے اور راستہ دکھانے کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ دکن کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں ولی اور سراج غزل کے بڑے شاعروں کی صف میں اس وجہ سے شامل ہوسکے کیوں کہ انھوں نے غزل کی اُس مخصوص روایت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جس کے سبب غزل فارسی میں طرّۂ امتیاز حاصل کرسکی۔ مثنوی اور غزل کی فضا میں واضح فرق ہے، اسے ولی سے قبل کے دکنی شاعروں نے صحیح طریقے سے سمجھنے میں کامیابی نہیں پائی۔ ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ غزل کی آزمائی ہوئی دنیا کو انھوں نے دکن کے مخصوص مزاج کے ساتھ شیر و شکر کرکے ایک ایسا کامیاب تجربہ کیا جس کی وجہ سے انھیں اردو کا پہلا بڑا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں فارسی کے مسلّم الثبوت شعرا کی ایک بھیڑ دہلی میں موجود تھی۔ اس کے باوجود ولی کی شاعری میں کون سا ایسا جادو تھا جس نے انھیں دہلی کے شعرا کو اپنی غزلوں پر غزلیں کہنے کے لیے دوسرے لفظوں میں اپنا تابع دار بن جانے کے لیے مجبور کیا۔ یہی سلسلہ سراج اورنگ آبادی نے بھی اپنے انوکھے شاعرانہ رنگ سے آگے بڑھایا۔ دکنی شاعری کی تاریخ میں غزل کے تعلّق سے ولی اور سراج دو ایسے چمکتے ہوئے ستارے ہیں جنھوں نے خود بہترین شعری سرمایہ یادگار چھوڑا اور شمالی ہندستان کے شعرا کی کامیاب رہنمائی کی۔

اٹھارویں صدی سے قبل دہلی میں اردو شعر و شاعری کا کیسا ماحول تھا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اسی زمانے میں جب مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو نے اس زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، یقیناً اس وقت اردو کا ایسا ماحول ہوگا جس کی وجہ

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دہلی میں اردو پیدا ہوئی۔ لیکن اس کے بعد کئی سو برسوں تک دہلی کے ادبی ماحول پر اردو کا کوئی اثر نہیں رہا۔ دہلی کے ماحول پر فارسی کی حاکمیت حاوی رہی۔ شعرا کو فارسی میں ہی طبع آزمائی کرنے سے فائدہ تھا۔ اردو تقریباً نامانوس زبان کی طرح اس درمیان دکھائی دیتی ہے۔ کم از کم شاعروں، ادیبوں اور علما کی حد تک یہ بات صد فی صد صحیح ہے۔ ایک اور لسانی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ علما کی زبان اور عوامی زبان میں شدید تفاوت ہے۔ اسی لسانی ماحول میں جب ولی کا کلام دہلی پہنچا تو کلامِ ولی کی شاعرانہ صفات نے ایک نیا ادبی منظر نامہ پیدا کیا۔ شاعری کی یہ نئی دنیا تھی۔ دہلی کے فارسی گو شعرا مختلف روایات سے وابستہ تھے۔ مقامی موضوعات کے مقابلے انھیں ایران و عرب کے تلازمے پسند تھے۔ اس وجہ سے بھی دہلی کی فارسی شاعری مقامی باشندوں کے درمیان اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہی۔ ولی کی غزلوں نے دہلی کی اردو شاعری کو راستہ دکھایا۔ سامنے کے لفظ، قرب و جوار کی زندگی اور رسوم و رواج کو شاعری کا حصہ بنانا، اخلاق اور تصوّف کے ساتھ ساتھ احساس اور جذبوں کی سچائی شعرائے دہلی کے لیے ایسے رہنما اصول تھے جن کی بنیاد پر دہلی کی نئی شاعری قائم ہوئی۔

ولؔی اور پھر سراؔج اورنگ آبادی نے اہلِ دہلی کے لیے جو نشانِ راہ طے کیے، اگلے پچاس برسوں میں تین نسلیں دہلی میں شعرا کی سامنے آئیں ـــــ ایہام گو، اصلاح زبان کے مویدین اور میرؔ و سوداؔ کے ہم عصر۔ ادب کی تاریخ لکھنے والے واقف ہیں کہ ان تینوں نسلوں پر ولؔی کے براہ راست اثرات پڑے۔ ایہام گو شعرا میں آبرؔو، فائزؔ، شاکر ناجی جیسے اہم شعرا کی نگرانی میں شمالی ہندستان میں غزل گویوں کی ایک پوری جماعت قائم ہوگئی۔ ولؔی سے ان شعرا نے ہندوی اظہار کو تو سیکھا لیکن نفسِ مضمون کی گہرائی سے دور رہے۔ تجربہ پسندی بہت تھی لیکن ہدف صحیح نہیں ہونے کی وجہ سے اس عہد میں شاعری کبھی لفظوں کا گورکھ دھندا بن جاتی ہے تو کبھی لذت کوشی کا منبع۔ انھیں وجوہات سے اصلاح زبان کے مجاہدین نے اردو شاعری کے دامن کو ایہام گویوں کی غلط کاریوں سے پاک کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِسے بجا طور پر ردِ عمل کی تحریک کہتے ہیں۔ مظہؔر جانِ جاناں کی قیادت میں شاہ حاتم، انعام اللہ خاں یقیؔن کے ساتھ مل کر اصلاحِ زبان کی تحریک چلاتے ہیں جس کا ایک بڑا سبب فارسی اور دکنی روایت کی آپسی مخاصمت ہے۔ تحریک کاروں کے ذریعہ متروکات کی جو فہرست تیار کی گئی، اس میں دکن میں آزمائے لفظوں کا حصہ ننانوے فی صدی تھا۔ یہ دہلی کے فارسی گو اساتذۂ فن کے مقابلے میں دکن کے ولؔی کے اثرات کو محدود کرنے کا ایک لائحۂ عمل بھی تھا۔ بڑی حد تک اصلاح زبان کے شعرا اس مہم میں کامیاب بھی ہوئے۔ شاہ حاتؔم نے اپنی کبر سنی کے باوجود نیا دیوان تیار کیا اور مثال قائم کی کہ پُرانی شاعری اور اصلاحِ زبان کے بعد کی شاعری میں واضح فرق ہے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، ایہام گویوں میں آبرو اور اصلاحِ زبان کے شعرا میں حاتؔم اور انعام اللہ خاں یقیؔن ایسے افراد ہیں جنھیں اہمیت دی جا سکتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس پائے کا شاعر نہیں جسے اہم غزل گو کی حیثیت دی جا سکے۔ اصل میں اردو کے عہد زرّیں کے لیے ان دونوں مخالف تحریکوں نے تجربے کی وہ بنیادی زمین تیار کی جس کی بدولت میرؔ، سوداؔ اور دردؔ جیسے شعرا دہلی کے آسمان پر ابھرے۔

اصلاحِ زبان کی تحریک کے بعد دہلی میں اردو شاعری کا جو منظر نامہ تیار ہوا، وہ تین عظیم شاعروں کی کوششوں سے ممکن ہو سکا۔ 1730 سے 1750 کے دوران سوداؔ، دردؔ اور محمد تقی میرؔ نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوانا شروع کر دیا۔ یہی وہ شعرا ہیں

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

جن کی بدولت اردو شاعری کی تاریخ میں اس مخصوص زمانے کو ''عہدِ زرّیں'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دہلی کے یہ تین شاعر نہیں بلکہ اردو غزل کے تین مکاتبِ فکر اور علاحدہ علاحدہ تین اسالیبِ غزل ہیں۔ سودا کے یہاں غزل کا مردانہ آہنگ پہلی بار اظہار کا مکمّل سلیقہ پاتا ہے۔ قصیدے سے الگ سودا کی غزل گوئی اردو شاعری کا وہ مخصوص لہجہ ہے جس سے استفادہ کر کے غالب اور آتش نے اپنی شاعری کی زمین تیار کی۔ درد اردو غزل میں صاحبِ تصوّف شعرا کے سر خیل ہیں۔ وہ نہ صرف ایک صاحبِ طریقیت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان کی شاعری میں تصوّف اور معرفت جیسے دقیق موضوعات پر سیکڑوں اشعار موجود ہیں۔ درد نے ''منتخب'' مضامین پیش کرنے کا ہُنر بھی اردو غزل گو یوں کو عطا کیا لیکن سودا اور درد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عہد کو اردو غزل کی تاریخ میر کی وجہ سے جانتی ہے۔ میر کی عمر طویل رہی اور وقت نے بھی انھیں تجربوں کا بڑا سرمایہ عطا کیا۔ تاریخ کا وہ ایک ایسا موڑ ہے جہاں سماجی اور سیاسی قدریں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ میر نے ان سب کو جوڑ کر ایک ایسی شاعری بنائی جسے آج دل اور دلّی کا مرثیہ کہا جاتا ہے۔ میر نے شاعری سے وہ کام لیا جس کے لیے عام طور پر تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے وقوعے تصرّف میں لائے جاتے ہیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اردو غزل کے قارئین میر کی معنویت قائم پاتے ہیں تو اس کے پیچھے انھیں اسباب کا دخل ہے۔

عہدِ زرّیں میں کئی اور شعرا ہیں جنھوں نے دہلی کو اپنی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ مصحفی، نظیر اکبر آبادی، جعفر علی حسرت اور اشرف علی فغاں جیسے شاعروں نے شمالی ہندستان کی اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ مصحفی کو اردو کا سب سے بڑا قادر الکلام شاعر کہا جاتا ہے۔ جس طرح وہ دہلی میں ممتاز ہیں، اسی طرح لکھنؤ میں ایک دو نہیں کل آٹھ دواوین یادگار چھوڑے۔ شاگردوں کی پوری ایک فوج کھڑی ہوگئی۔ زبان کی صفائی اور محاورات کا استعمال اردو میں مصحفی سے لوگوں نے سیکھا۔ نظیر اکبر آبادی یوں تو صنفِ نظم کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن سودا کی طرح ہی وہ بھی اچھا خاصا غزلیہ سرمایہ پیش کر چکے تھے۔ زبان کا عمومی سطح پر آ کر استعمال اور تجربوں کی وسعت اُن کی شاعری بالخصوص غزل کا امتیاز ہے۔ حسرت اور فغاں کو دہلی کے مہاجر شعرا کا اوّلین نمائندہ مانا جاتا ہے جنھوں نے لکھنؤ پہنچ کر شاعری کا ایک نیا سلسلہ اور جہانِ معنیٰ تیار کیا۔ لکھنؤ اسکول کے ابھرنے سے پہلے دہلی غزلیہ شاعری کے معاملے میں سب سے اونچے مقام پر موجود تھی۔ میر کو اگر ''ناخدائے سخن'' کہا جاتا ہے اور غالب نے بھی انھیں استاد اور خود کو ان کا پیرو کار مانا تو یہ اردو شاعری میں میر کا وہ امتیاز ہے جس کے مقابل کوئی دوسری شخصیت کبھی ابھر نہیں سکی۔

دہلی کے مہاجر شعرا اور اودھ کے خطّہ میں شعرائے اردو کی پہلی نسل نے مل کر اردو غزل کا ایک نیا انداز وضع کیا۔ یہ صحیح ہے کہ جو شعرا دہلی سے اودھ تشریف فرما ہوئے، اُن کی شاعری میں کوئی بڑی تبدیلی رونما ہو جائے گی، اس کا زیادہ امکان نہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے سیاسی اور سماجی ماحول میں کوئی ایسا امتیاز شاید ہی دیکھنے کو ملے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ دونوں مقامات کی شاعری میں آسمان زمین کا فرق ہونا چاہیے۔ شعرائے لکھنؤ اور مہاجر شعرا نے مل کر ایک مختلف رنگِ سخن قائم کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر میر، سودا اور درد نے اردو غزل کا جو سلسلہ قائم کیا تھا، اس سے گریز کی صورت پیدا ہوئی۔ انشا اللہ خاں انشا، سعادت یار خاں رنگین، امام بخش ناسخ، قلندر بخش جرأت نے واقعتاً ارضِ لکھنؤ میں اردو غزل کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ اردو تنقید نے

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions Empowering Technologies...

جس شاعری کے نفسِ مضمون کے بارے میں ''چوماچاٹی'' کہا تھا، وہ اصل میں انھیں شعرا پر نافذ ہوتا ہے۔ استادانہ رکھ رکھاو کے نام پر ''ٹھس'' شاعری کا کاروبار عام ہو گیا۔ محاورہ بندی، معاملہ بندی، رعایتِ لفظی کا اس زمانے کی غزل میں دور دورہ رہا۔

میر حسنؔ نے پانچ سو سے زیادہ غزلیں کہیں لیکن اُن کی شناخت مثنوی نگار کے طور پر ہوئی۔ میر حسنؔ کی غزلوں میں مثنوی جیسی روانی اور محاکات وجذبات نگاری یا تہذیب وثقافت کی جلوہ گری بھلے موجود نہ ہو لیکن زبان اور جذبوں کی شفافی انھیں قابلِ ذکر غزل گو بناتی ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں خواجہ حیدر علی آتشؔ ایسے تنہا غزل گو ہیں جن کے سرمایۂ سخن پر اودھ کو ناز کرنا چاہیے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ آتشؔ ایسے واحد لکھنوی شاعر ہیں جنھوں نے دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے بیچ نقطۂ مفاہمت ڈھونڈ نے کی کامیاب کوشش کی۔ لہجے کی سطح پر آتشؔ نے سوداؔ کے رنگِ سخن کی طرف دھیان کیا اور مضمون کے لیے خواجہ میر دردؔ کو نشانِ راہ بنایا۔ زبان کے سارے لکھنوی کرتب بھی ان کے پیشِ نظر رہے۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ لکھنؤ میں اردو غزل کی ایک قد آور شخصیت سامنے آئی۔ جس طرح مثنوی میں میر حسنؔ، مرثیہ میں انیسؔ اور دبیرؔ نے اپنی صلاحیتوں سے ایسا ادبی منظر نامہ قائم کیا جسے ایک ہی وقت میں لکھنؤ اور دہلی دونوں میں قبولیت ملنے لگی، اُسی طرح خاکِ لکھنؤ سے ابھرے غزل گویوں میں صرف خواجہ آتشؔ کی یہ حیثیت ہے کہ انھیں ہر دبستان کے لوگ یکساں امتیاز عطا کریں۔

اٹھارھویں صدی میں دہلی کے شعرا کے لیے مشکلات بہت تھیں لیکن شعر وادب کی محفلیں سونی نہیں ہوئیں۔ انیسویں صدی کے پہلے ارбع میں پھر غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ کی شکل میں شعرا کا ایک ایسا قافلہ سامنے آیا جس نے اردو غزل کے سرمائے میں اپنی صلاحیتوں سے واضح اضافے کیے۔ یہ دوسرا موقع ہے جب دہلی میں ''عہدِ زرّیں'' کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ غالب نے مضمون آفرینی، جدّت طرازی، بلند خیالی اور فلسفہ پیمائی کی بنیاد پر ایک ایسا شاعرانہ طلسم قائم کیا جس کی معنیاتی دنیا اب بھی صاحبانِ ذوق کے لیے حیرت زائی کا باعث ہے۔ اپنے دیوان کے اختصار سے غالبؔ نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ شاعری کے دفتر سجا دینے سے بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا جاتا بلکہ منتخب جذبوں کی پُر اثر ترجمانی شاعر کا فریضہ ہے۔

حکیم مومن خاں مومنؔ، غالبؔ جیسے جلیل القدر ہم عصر کے باوجود اردو غزل میں اپنا ذاتی اسلوب قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سادہ سے الفاظ اور عشق وعاشقی کے معصومانہ جذبات، انسانی زندگی کی سچّی ترجمانی، مومنؔ کا وصفِ خاص ہے۔ غزل کو میرؔ نے اپنے عہد کے حقائق کا ترجمان بنایا اور غالبؔ نے افکار کی بلندیاں عطا کیں۔ اس مرحلے میں نازک اور لطیف جذبوں کی ترجمانی بڑے غزل گویوں کے لیے دور کی کہانی ہو گئی تھی۔ حالاں کہ غزل کی تاریخ عاشقانہ جذبوں کے بے ریا اظہار سے بھری پڑی ہے۔ مومنؔ کا یہ شاعرانہ کمال ہے کہ انھوں نے غزل کو اس کی نازک خیالی کے ساتھ پھر سے زندہ کیا۔

ذوقؔ قصیدہ گوئی اور استادانہ رکھ رکھاو کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ مشکل قوافی اور ردیف میں غزلیں کہہ کر انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ''استادِ شہہ'' کی قادر الکلامی کیسی ہوتی ہے۔ ذوقؔ نے سادہ لفظوں میں بھی بعض غزلیں کہیں۔ قصیدہ گو کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت انھیں غزل کا تاج نہیں پہنا سکی۔ ذوقؔ کے شاگردوں میں داغؔ دہلوی ایک نئے انداز کو قائم کرنے میں مشہور ہوئے۔ لکھنؤ میں ''زبان کی شاعری'' کا بڑا چرچا تھا۔ داغؔ نے دہلوی معاشرے میں اِسے بہ کمال آزمایا۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

محاوروں سے کھیلنا اور دہلی کی زبان کا شعری نگار خانہ تیار کرنا، دورِ آخر کے شاعروں میں صرف داغ کے حصّے میں آیا۔ داغ نے مومن کی طرح سلجھی ہوئی عاشقانہ شاعری کو برتنے کے بجائے جرأت اور رنگین کی طرح غیر تہذیبی زمروں میں سیر کرنے کی کوشش کی۔ یہی داغ کی شاعری کی حد ہے۔ آج داغ کی تاریخی اہمیت زبان کے شاعر کی حیثیت سے ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں داغ کے علاوہ جن غزل گو شعرا نے اپنی شناخت قائم کی، اُن میں حالی اور اکبر اہم ہیں۔ ہر چند کہ حالی کی پُرانی اور نئی غزلوں کی تقسیم ایک مشہور بات ہے اور خود حالی نے ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں غزل گوئی کے تعلق سے اپنے ذہنی تعصبات ظاہر کیے ہیں لیکن حالی کی غزلیں بالخصوص پرانی غزلیں اردو غزل کا ایک علاحدہ رنگ ہیں۔ جذبوں کی حقیقی ترجمانی اور زبان کا سلجھا ہوا انداز حالی کا وہ معیارِ سخن ہے جس سے اُن کی شناخت قائم ہوئی۔ رشید حسن خاں نے حالی کے مقدمے سے پہلے والی شاعری یعنی پُرانی شاعری کی تعریف کی ہے اور 1893 کے بعد کی غزلوں کو ''بے رس'' کہا ہے۔ حالی دورِ اوّل میں بہترین غزل گو، دورِ دوم میں ممتاز نظم نگار اور دورِ سوم میں ناقد اور سوانح نگار ہیں۔ حالی کے ہم عصروں میں اکبرالٰہ آبادی یوں تو اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے اہم ہیں لیکن اُن کے دیوان میں شامل غزلوں کے مطالعے سے اُن کی غزل گوئی قابلِ توجہ ہو جاتی ہے۔ حالی اور اکبر دونوں اردو میں قومی ضرورتوں کے اعتبار سے شعر گوئی کرنے والے ایسے فن کار ہیں جنھیں سیاسی اور سماجی احوال کے پیشِ نظر غزل کو بدلنے کی ذمّے داری ملی تھی۔ اس کام میں دونوں شعرا بے حد کامیاب رہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس روایت کا مینارۂ نور اقبال نہیں بن سکتے تھے۔

اقبال، شاد اور حسرت کو جدید غزل کا معمار کہا جاتا ہے۔ عمر کے اعتبار سے شاد کو اوّلیت حاصل ہے۔ دبستانی تفوق کے ماحول میں شاد عظیم آبادی نے لکھنؤ اور دلّی کی صالح قدروں کو اپنی شاعری کا حصّہ بنایا۔ فارسیت کے ساتھ ہندی اسلوب کو بھی اُن کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اب تک کسی استاد شاعر نے ''فارسی شاعری کا نمک'' اور ''ہندی شاعری کا درد'' یکجا کرنے میں کامیابی نہیں پائی تھی۔ یہ شاد کا بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال دورِ اوّل سے ہی لکھنؤ اور دلّی سے الحاق کے خلاف تھے۔ اقبال کے غزلیہ سرمائے کے مقابلے نظمیں زیادہ ہیں لیکن جب بالِ جبریل کی غزلوں اور اقبال کی بعض مشہور نظموں کے غزلیہ انداز کا جائزہ لیا جاتا ہے تو انھیں نہ صرف اپنے عہد میں ایک نئی غزل بنانے والے شاعر کے طور پر پہچانا جاتا ہے بلکہ اردو کے عظیم شعرا کی صف میں بھی انھیں میر و غالب کے بعد جگہ دی جاتی ہے۔ اقبال اردو کے ایسے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم اور غزل کے بیچ کی دوری کو کم کیا۔ شمیم حنفی نے تو تجزیہ کرکے یہ بتادیا ہے کہ اقبال کی غزل میں نظم اور نظم میں غزل گھل مل گئی ہے۔ غالب نے غزل کو فکری اڑان عطا کی تھی لیکن اقبال نے اسے باضابطہ فکر و فلسفہ کا ترجمان بنایا۔ قومی ضرورتوں کا پاس اقبال کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ حسرت نے اردو کی عاشقانہ غزل کو نئے عہد کے اعتبار سے بدلنے میں کامیابی پائی۔ حسرت کی شاعری میں محبوبہ ہم مشرب ہے۔ اظہارِ عشق کے لیے بھی حسرت نے عورت کو موقع دیا۔ محبوبہ گھریلو عورت یا بیوی ہو سکتی ہے، غزل میں یہ تصور حسرت کے تعلق سے اجاگر ہوا۔ بعد کی غزل پر شاد، اقبال اور حسرت تینوں کے گہرے اثرات ہیں۔

اقبال کی زندگی میں ہی ترقّی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ ترقّی پسندی کے ابتدائی دور میں غزل کو جاگیردارانہ عہد کا

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

علم بردار مان کر احتراز برتنے کی کوشش ہوئی۔ یہ بات مشہور ہوئی کہ ’’شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل‘‘۔ جوشؔ سے لے کر جگرؔ مرادآبادی تک شعرا اپنی غزلوں پر عنوان ڈال کر رسائل اور مجموعوں میں منظومات کے بطور شائع کراتے رہے۔ تاریخی اعتبار سے غزل کے لیے یہ مشکل دور تھا۔ ترقی پسندی کے ابتدائی زمانے میں تحریک سے الگ تھلگ رہنے والے دو شاعروں نے غزل گو کی حیثیت سے اپنی جگہ قائم کی۔ فراقؔ اور یگانہ چنگیزیؔ اس عہد میں اردو غزل کے دو مستند اسالیب کے روح و رواں مانے گئے۔ اقبالؔ کے بعد اردو غزل کا ایک سلسلہ ترقی پسندوں سے ملتا ہے، بقیہ دو دھارے فراقؔ اور یگانہؔ سے۔ فراقؔ نے ابتداً میرؔ کے لہجے کو اپنے شعور کا حصّہ بنانے کی کوشش کی۔ ترقی پسندوں کے انقلابی تصور کے سامنے فراقؔ نے شاعری کی ہند ایرانی عاشقانہ روایتوں کو اپنی ذات میں مدغم کرنے کا کام کیا۔ فراقؔ اسی وجہ سے غزلیہ شاعری کے ایک نئے اسلوب کو وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اقبالؔ کے بعد بلاشبہ فراقؔ غزل گو کی حیثیت سے سب سے توانا اور مستحکم آواز ہیں۔

یگانہؔ کی غالب شکنی زیادہ مشہور ہوئی اور شخصیت کے تشدد آمیز رویے نے اُن کی شاعری کو نقصان پہنچایا۔ میر، سودا، غالب اور آتشؔ جیسے شعرا کے اسالیب کے امتزاج سے اگر کوئی علاحدہ اسلوبِ غزل پیدا ہو سکتا ہے تو وہ یگانہؔ کی شکل میں ہوگا۔ یگانہ کی یہ اضافی بدنصیبی ہے کہ انھیں صرف لفظوں کے توڑ پھوڑ کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ یگانہؔ میں سوز اور دردمندی بھی ہے۔ رقت آمیزی اُن کی شاعرانہ شخصیت کا جزوِ خاص ہے۔ ان سب پر مستزاد مردانہ آہنگ، محاورات کا بڑے پیمانے پر استعمال اور کسی بھی لفظ سے معنیٰ نکال لینے کا ہنر یگانہؔ کا شناخت نامہ ہے۔ سادہ لفظوں پر انحصار کر کے غزل بنانا بیسویں صدی میں صرف یگانہؔ کو آیا۔ ایک ہی ساتھ کلاسیکیت اور باغی لہجہ، یگانہؔ کے علاوہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ شادؔ عارفی، مظفرؔ حنفی، صدیق مجیبی، شجاعؔ خاور، منوّر رانا اور خورشیدؔ اکبر جیسے شعرا ابھرے جن پر یگانہؔ کی شخصیت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔

ترقی پسندوں کے حلقے میں عام طور پر غزل گو شعرا کے لیے اچھے خیالات نہیں پیش کیے جاتے تھے۔ اس کے باوجود مجروحؔ سلطان پوری اور غلام ربانی تاباںؔ نے غزل گوئی کو ہی اظہار کا آئینہ بنایا۔ مجروحؔ کی غزلیں مخصوص ترقی پسندانہ مفاہیم کی وجہ سے بھی زیادہ مشہور ہوئیں۔ مجروحؔ نے تو نظموں سے بھرپور بے اعتنائی برتی۔ مجروحؔ کا سرمایۂ سخن زیادہ نہیں لیکن ترقی پسندانہ شعور کو غزل کے ذریعہ عام کرنے میں ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ مجروحؔ نے بعض روایتی اصطلاحوں کو ایسے ترقی پسندانہ مفاہیم عطا کیے جو آج مقبولِ خاص و عام ہیں۔ فیضؔ نے ابتداً کم غزلیں کہیں لیکن دھیرے دھیرے اگلے مجموعوں میں غزلوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ فیضؔ کی شخصیت میں جو فکری اور جذباتی توازن تھا، اسی نے انھیں ایسا ترقی پسند شاعر بنایا جسے ہر حلقے میں قبولیت ملی۔ فیضؔ نے روایت سے روشنی لی اور اپنے عہد کی جفاکشی سے اُسے جوڑا۔ معین احسن جذبیؔ کے مختصر سرمایۂ سخن میں غزلیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مخدومؔ محی الدین نے محض اکیس غزلیں لکھیں لیکن ترقی پسندوں کے درمیان غزل کے جو کامیاب شعرا ہیں، اُن میں مخدومؔ کا شمار ہوتا ہے۔

جمیلؔ مظہری، روشؔ صدیقی، سیمابؔ اکبرآبادی، جگرؔ مرادآبادی اور بزرگ شعرا میں فانیؔ اور اصغرؔ اصلاً روایتی دبستان کے غزل گو ہیں۔ فلسفہ طرازی، تصوّف، انسانی دردمندی اور کبھی کبھی باغیانہ انداز ان تمام شعرا میں موجود ہے۔ اس کے باوجود

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

انھیں اپنے بعد کے لوگوں کو متاثر کرنے والا شاعر قرار دینا صحیح نہیں۔ اِن میں سے کئی ترقی پسندوں سے متعلق بھی ہوئے لیکن ترقی پسندی ان کے مزاج کا حصّہ نہیں بن سکی۔ دوسرے ترقی پسند شعرا میں جن کی بعض غزلیں پہچانی جاتی ہیں، اُن میں ساحرؔ لدھیانوی، پرویزؔ شاہدی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اہمیت کے حامل ہیں۔ ترقی پسند عہد میں غزل گو، نظم نگاروں کے مقابلے زیادہ نہیں ابھر سکے۔ اس کے باوجود ترقی پسند غزل اردو کی تاریخ کا ایک مکمل باب ہے اور عہدِ اقبال اور جدیدیت کے درمیانی وقفے میں یہ شعرا اپنی شناخت قائم کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہوئے۔

1947 کے بعد دھیرے دھیرے ترقی پسندانہ تصوّرات کی ادبی پہچان زائل ہونے لگی۔ ترقی پسندوں کا ایک حلقہ اشتراکیت کو کُل کائنات سمجھنے لگا۔ جس کی وجہ سے غزلیہ شاعری نعرے میں تبدیل ہونے لگی۔ ترقی پسندوں کی نئی نسل اِن مسائل پر توجہ دے رہی تھی۔ ترقی پسندوں سے باہر بھی اردو غزل کی بعض معتبر آوازیں موجود تھیں۔ اسی موقعے سے اتباعِ میرؔ اور فراقؔ کے لہجے کو اپنانے کے مرحلے میں اردو کے تین ایسے غزل گو سامنے آئے جنھیں جدیدیت کی غزل گوئی کا نمائندہ مانا جاتا ہے۔ ناصرؔ کاظمی، ابنِ انشا اور خلیلؔ الرحمان اعظمی نے ایک ایسی غزل ایجاد کی جس میں ذات کی محرومی، اکیلے پن اور شہری زندگی کے عذاب، موضوع بن رہے تھے۔ ان تینوں شاعروں نے ترقی پسندی سے گریز کا راستہ تو طے کیا لیکن اردو کی روایتی شاعری کے انداز سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ابنِ انشا کا بیراگی روپ، ناصرؔ کاظمی کی گم شدگی، اپنے زمانے کے سچّے حالات کے مقابل خلیلؔ الرحمان اعظمی کی طرح کھڑا ہونا اردو کی جدید غزل کو مقبول بنانے میں کامیاب حربے کے طور پر سامنے آئے۔ حسنؔ نعیم، مظہرؔ امام، باقرؔ مہدی، شہزادؔ احمد جیسے شعرا جدید غزل کے ان ابتدائی بنیاد گزاروں میں ہیں جنھوں نے 1960 سے قبل نئی غزل کا خاکہ تیار کیا۔

1960 کے آس پاس اردو کی جو نئی غزل سامنے آئی، اس کے دو رنگ واضح تھے۔ سب سے مقبول لہجہ جس سے جدید شعرا پہچانے گئے، وہ اینٹی (Anti) غزل کا تھا۔ تجربہ پسندی کے انتہا مقام پر پہنچ کر شعرا نے غزل کے سارے روایتی گوشوں کو تیاگ کر ایک ایسی غزل تیار کرنے کی کوشش کی جس کا سلسلہ پیچھے سے نہیں ملتا تھا۔ عادلؔ منصوری، محمد علویؔ، افتخارؔ عارف، کمارؔ پاشی، انیسؔ ناگی نے جو غزلیں کہیں، اُن کے الفاظ، مضامین اور اسالیب نے غزل کی روایت سے پورے طور پر خود کو الگ کیا۔ شاید اسی لیے اِن غزل گو شعرا کا لطفِ بیان کے طور پر تو ذکر ہوتا رہا لیکن جدید غزل کو انھوں نے کوئی نیا رنگ دیا ہو، اسے ماننے والا شاید ہی کوئی ملے۔ اس زمانے میں جو بے سروپا نظمیں کہی جا رہی تھیں، اُن کے بھی اثرات اِن غزلوں پر رہے۔

اینٹی (Anti) غزل کے دور میں ہی سلجھے ہوئے انداز میں زندگی کے نئے حقائق کو پیش کرنے والے شعرا کم نہیں تھے۔ شکیبؔ جلالی، بانیؔ، زیب غوریؔ، سلطانؔ اختر، بشیرؔ بدر، ندا فاضلی، شہریارؔ، بشر نوازؔ، حسنؔ کمال، لطفؔ الرحمٰن، علقمہ شبلیؔ، قیصرؔ شمیم جدیدیت کے عہد کے وہ نمائندہ غزل گو ہیں جن کی غزل گوئی نے 1960 کے بعد کی اردو شاعری کی نئی تصویر قائم کی۔ انھیں شعرا کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ نظم نگاری کے مقابلے پھر ایک بار غزل گو شعرا نے اپنی تخلیقی قوت سے اپنے عہد کا ادبی امتیاز پایا۔ جدیدیت کے سارے مشہور مضامین، تراکیب، پُرانی غزل سے واضح نقطۂ انحراف، اس عہد کی غزل کا امتیازی نشان ہے۔ اینٹی (Anti) غزل سے جدیدیت کی غزل کو جو نا مقبولیت ملی تھی، اس کی بھرپائی نئے غزل گویوں سے بہ احسن ہوگئی۔ اِن میں سے اکثر غزل گو اپنا علاحدہ

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

رنگِ سخن قائم کرنے میں مصروف ہیں۔

1970 کے بعد غزل گویوں کا ایک نیا حلقہ سامنے آیا جس کا ایک سلسلہ جدید شعرا سے متعلّق تھا تو دوسرا بدلتی ہوئی زندگی سے مل رہا تھا۔ عرفان صدیقی، ظفر گورکھ پوری، اسعد بدایونی اور شجاع خاور جیسے شعرا کو نہ تو جدیدیت کے زمانے کا پروردہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے الگ تھلگ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان شعرا نے جدیدیت سے الگ ہونے کا اعلان تو نہیں کیا لیکن ایک علاحدگی کا انداز یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا واضح رنگ 1980 کے بعد کے شعرا میں دیکھا جاسکتا ہے۔ شہپر رسول، عبدالاحد ساز، خورشید اکبر، عالم خورشید، شہاب الدین ثاقب، خالد عبادی، جمال اویسی، مہتاب حیدر نقوی، فرحت احساس جیسے شعرا واضح طور پر جدیدیت کی غزل سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان نسل کی لفظیات، موضوعات اور طرزِ حیات —— سب ترقّی پسندوں اور جدیدیوں سے الگ ہیں۔ سہولت کے لیے انھیں مابعد جدید غزل گو قرار دیا جاتا ہے۔ اردو غزل کے آسمان پر موجودہ زمانے میں جدید شعرا کی آخری نسل اور مابعدِ جدید شعرا کی پہلی اور دوسری نسل سرگرم سفر ہے۔

موجودہ عہد کے غزل گو شعرا کی تخلیقی سمت و رفتار پر غور کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں مختلف روایتوں کا واضح نشان موجود ہے۔ کلاسیکیت سے گریز، ترقّی پسندی، جدیدیت جیسے مختلف اور متضاد عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ غزل گوئی میں یہ امتزاجی رنگ نہایت خوش آیند ہے۔ اقبال کے عہد کے بعد اردو غزل میں کچھ انفرادی لہجے ضرور ابھرے لیکن غزل کے تئیں ایک عمومی بہتری کا ماحول نہیں پیدا ہوسکا۔ ترقّی پسندی میں نظم گوئی زیادہ اعتبار حاصل کر سکی اور جدیدیت کے زمانے میں بھی نظم نگار چھائے رہے۔ 1970 کے بعد اور خاص طور پر 1980 کے بعد غزل گویوں کا ایک مضبوط قافلہ میدان میں آیا۔ ان غزل گویوں کے متعلّق آپ آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کلاسیکیت کو یہ نہیں سمجھتے۔ عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، شہپر رسول، عبدالاحد ساز اور خورشید اکبر کے یہاں بھرپور کلاسیکی شعور بھی ہے۔ ترقّی پسندوں پر یہ الزام تھا کہ رنج کی باتیں اُن کے یہاں نہیں ہیں لیکن موجودہ عہد کے غزل گویوں میں اکثر شعرا کے یہاں دلی واردات و کیفیات اپنی گہرائی کے ساتھ موجود ہیں۔ تجربہ پسندی کا ہنر بھی اگر دیکھنا ہو تو شجاع خاور، منوّر رانا، خالد عبادی اور خورشید اکبر کی شاعری بطور مثال سامنے رکھی جاسکتی ہے۔ ایک طویل مدّت کے بعد ایسا موقع غزل گو شاعروں کے ہاتھ آیا ہے جب غزل گوئی کے خلاف کوئی اعلان شدہ ممانعت نہیں ہے۔ مختلف تجربوں میں دو تین نسلوں نے یہ دیکھ لیا کہ غزل کا کامیاب سلسلہ امتزاج میں ہے۔ میر اور غالب نے جس طرح کائنات اور ذات کے تجربوں کو شیر و شکر کر کے غزل کے قالب میں ڈھالا تھا، وہی اب بھی غزل کے لیے بہترین ماڈل ہے۔ اس عہد کے شعرا اسی نہج پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

غزل کی طویل تاریخ اچھے خاصے نشیب و فراز کے دور سے گزری۔ اکثر اس کی صنفی حیثیت پر اعتراضات ہوئے اور ہر زمانے میں اس کی ترقّی کے بارے میں شبہات روا رکھے گئے۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور نظم جیسی صنفوں سے الگ الگ زمانے میں غزل کا مقابلہ رہا۔ حقیقت یہی ہے کہ غزل تمام مورچوں پر خود کو سربلند رکھنے میں کامیاب رہی۔ یہ سوال اہم ہے کہ ہر دور میں غزل کیوں کامیاب ہوتی گئی۔ ہر زمانے کے مستند غزل گو شعرا کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل گو شعرا اپنی شاعری کی بنیاد ''حقیقی جذبات'' اور ''روحِ عصر'' پر رکھتے ہیں۔ اردو کی کوئی کلاسیکی صنف ایسی نہیں جس کے لیے یہ دونوں باتیں کہی جاسکیں۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

وؔلی سے لے کر موجودہ عہد کے شعرا تک غزل کا ہر شاعر ظاہر اور باطن دونوں دنیا کی سیر کرتا ہے۔ کلاسیکی دور میں اسے غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے یاد کیا جاتا تھا۔ میؔر کے یہاں اسے 'دل اور دہلی کا مرثیہ' کہتے ہیں۔ غزل کی مقبولیت کو سمجھنے کے لیے غزل کی داخلی دنیا کی طرف توجہ ضروری ہے۔ عاشقانہ شاعری کے لیے سب سے بہتر حربہ غزل، صوفیانہ شاعری کے لیے آزمائی ہوئی صنف غزل، رندی و سرمستی کے لیے غزل، موسیقی کے لیے غزل، فاسقانہ جذبات کے لیے غزل، خدا ترسی کے لیے غزل —— زندگی کی کون سی منزل ہے جہاں غزل گو ہمیں خالی ہاتھ بھیجتا ہے۔ غزل کی محدودیت جس کی طرف حاؔلی اور کلیم الدین احمد متوجہ کرتے ہیں، وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن اردو شاعری میں کوئی دوسری ایسی صنف نہیں جس کے پاس اتنا وسیع نقطۂ نظر اور گہرا انسانی اور فنی شعور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غزل مختلف ادوار میں ضرورت کے اعتبار سے اپنی صورت کو بدلتے ہوئے نہ صرف ہمارے عہد میں قائم ہے بلکہ آیندہ بھی اس کی طاقت ور موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مختصر گفتگو

۱۔ غزل کی صنفی خوبیاں بتائیے۔
۲۔ دکن کے پانچ غزل گو شعرا کے نام بتائیے۔
۳۔ ایہام گوئی سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ دو ایہام گو شاعروں کے نام لکھیے۔
۴۔ میؔر کی غزل گوئی سے اپنی واقفیت کو تحریر کیجیے۔
۵۔ سرزمینِ دہلی سے تعلق رکھنے والے دس غزل گویوں کے نام لکھیے۔
۶۔ دہلی سے اودھ ہجرت کرنے والے شعرا کی ایک فہرست بنائیں۔
۷۔ ''اینٹی غزل'' کے تصوّر سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ ''دہلی میں اردو شاعری : ایہام گوئی سے عہدِ زرّیں تک'' —— اس موضوع پر ایک مختصر مضمون تحریر کیجیے۔
۲۔ لکھنؤ کی غزل گوئی کو موضوعِ بحث بنائیے۔
۳۔ حالؔی اور اکبؔر کی غزلوں کے محاسن کیا ہیں؟ مفصّل بیان کیجیے۔
۴۔ اقبالؔ کی غزل گوئی کے امتیازات واضح کیجیے۔
۵۔ ترقّی پسندوں کی غزل گوئی کے سلسلے سے ایک تعارفی مضمون لکھیے۔
۶۔ ہر دور میں غزل کی مقبولیت کی وجہ کیا ہے؟ اپنے تاثرات کو دلیلوں سے واضح کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

نظم نگاری

سرسیّد کی تحریک کے زیرِ اثر مغرب کی تیز ہواؤں کا جو شور اٹھا، اُسی میں نظمِ جدید کی داغ بیل پڑی۔ مغرب میں نظم کے لیے یہ طریقہ اپنایا جاتا تھا کہ کسی خیال کو شروع سے آخر تک ترتیب سے بیان کیا جائے جو غزل سے بالکل مختلف ہے۔ ''انجمنِ پنجاب'' کے جلسوں میں محمد حسین آزاد اور حالی اپنی ابتدائی نظمیں پیش کر رہے تھے۔ اس وقت تک علی گڑھ تحریک سے حالی کا تعلق بھی قائم نہیں ہوا تھا لیکن مغرب کے علمی خزینوں سے استفادہ کرنے کے تئیں سرسیّد کی صلاح اب عام طور پر لوگ ماننے لگے تھے۔ محمد حسین آزاد کو بھی ایک موقع ملا کہ انگریزوں کی مدد سے مغرب میں شعر و ادب کے حلقے میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ محکمۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب نے 1865 میں جس 'انجمن پنجاب' کو Useful knowledge کی توسیع کے لیے قائم کیا، اس میں محمد حسین آزاد کی نظامت کے دوران جان پڑ گئی۔ 1867 میں انھوں نے تعلیم اور شعر و ادب کے موضوعات پر 23 لکچر دیے۔ خاص طور سے 5 اگست 1867 اور 19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے جو خطبات دیے، وہ اردو کی جدید نظم کی تاریخ میں آئین کے طور پر مسلّم ہیں۔ یہیں سے نظمِ جدید کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل چراغ سے چراغ جلتے گئے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو کی نظمِ جدید مغرب کی نظموں کے زیرِ اثر ''انجمنِ پنجاب'' کی نشستوں میں سامنے آئی لیکن اردو میں موجود ماقبل سرمائے کا جائزہ لینے پر پتا چلتا ہے کہ جیسی نظمیں حالی اور آزاد نے پیش کیں، ویسی تخلیقات اردو میں پہلے سے موجود تھیں جنھیں نظم کی تاریخ کا حصہ نہیں ماننا کوتاہ نظری اور بے انصافی ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ نے جو موضوعاتی نظمیں کہیں، انھیں آخر نظم کی تاریخ سے کیوں ہٹایا جائے۔ خاص طور سے اپنی محبوباؤں کی تعریف میں بادشاہ نے جو مختصر نظمیں کہیں، وہ صد فی صد نظمِ جدید کے دائرۂ کار میں شامل ہونے کا جواز رکھتی ہیں۔ ابتدائی شعرا میں دکن میں ولی اور دہلی میں فائز دہلوی کے ہاں اچھی خاصی تعداد میں نظمیں موجود ہیں۔ فائز کے دیوان میں میلا، پنگھٹ اور تہواروں کے ساتھ قدرتی مناظر پر جو نظمیں موجود ہیں، انھیں اردو نظم کی تاریخ میں الگ قط نہیں کیا جا سکتا۔ فائز نے مغرب کے مقامیت والے رجحان کو بھی از خود اپنی نظموں میں آزما لیا تھا۔

اردو کی جدید نظم یا قدیم نظم اپنے عظیم ہنرمند شاعر نظیر اکبرآبادی کے کمالات سے استفادہ کیے بغیر اپنے معیار کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی تھی۔ نظیر اکبرآبادی اردو کی ادبی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں اور یہ فضیلت انھیں غزل گوئی کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ اُن کا اصل کارنامہ نظم نگاری سے متعلق ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے واقعتاً نظم کے موضوعاتی اور ہیئتی امکانات تلاش کیے۔ اس حقیقت کا اعتراف تکلیف دہ ہے لیکن یہ سچائی ہے کہ مغرب اور مشرق دونوں کے علمی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

باوجود اردو میں بہ شمولِ حالؔی اور آزادؔ کوئی دوسرا ایسا نظم نگار سامنے نہیں آسکا جس کے پاس کائنات اور زندگی کا اتنا گہرا اور وسیع تناظر موجود ہو۔ عوامی رجحان اور تہذیب و ثقافت کی نیرنگیوں کو اپنی نظم گوئی کا حصّہ بنا کر نظیر نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی کوئی دوسری مثال اردو میں نہیں ملتی۔

19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزادؔ نے جدید شاعری کے موضوع پر جو لکچر دیا، اُسی کے ساتھ اپنی ایک نظم 'شبِ قدر' بھی پیش کی۔ عام طور پر اسی تخلیق کو اردو کی پہلی جدید نظم قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اس انداز کی موضوعاتی نظمیں اسماعیلؔ میرٹھی اور حالؔی نے لکھی تھیں لیکن وہ تمام انگریزی نظموں کا ترجمہ تھیں۔ آزادؔ نے اپنی نظم سنانے کے بعد آئندہ ماہ کی نشست کے لیے 'برسات' موضوع سے نظمیں لکھنے کی دعوت دی۔ 30 مئی کے مناظمے میں حالؔی کی 'برکھا رُت' اور آزادؔ کی نظم 'ابرِ کرم' سامنے آئیں۔ آیندہ مشاعروں میں حالؔی، محمد حسین آزادؔ اور اسماعیلؔ میرٹھی نے لگاتار نظمیں پیش کیں۔ محمد حسین آزادؔ نے تو سبھی نو مشاعروں میں اپنی نظمیں سُنائیں۔ اسی سے ان کے دیگر ہم عصروں میں نظم گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلؔی نعمانی، عبدالحلیم شررؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی نے اس صنف میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے نظم گوئی کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی میں اقبالؔ، چکبستؔ اور نظم طباطبائی نے نظم گوئی کی طرف پوری توجہ کی۔ نظم گوئی میں ہیئت کے سب سے زیادہ تجربے طباطبائی نے کیے۔ Sonnet اور نظمِ معریٰ کی طرف انھوں نے خصوصی توجہ کی۔ چکبستؔ نے مسدّس کا بہترین استعمال کر کے اردو کی قومی شاعری میں اپنی جگہ قائم کی۔ نظیرؔ اکبرآبادی کے بعد اقبالؔ اردو نظم کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ اقبالؔ نے بھی ہیئت اور موضوع دونوں کی سطح پر بہت واضح تبدیلیاں کیں۔ اقبال ہی نے یہ بتایا کہ نظموں میں فکر و فلسفہ کی بنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں۔ اقبالؔ کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ نظموں کو عالمانہ موضوعات کی ترسیل کے لیے بھی آزمانے کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔ مسدّس، مثنوی کے ساتھ ساتھ ترکیب بند اور ترجیع بند اقبالؔ کی مرغوب ہیئتیں ہیں۔ اقبالؔ کی نظم گوئی کے بعد ایک نئی نظم کا سلسلہ قائم ہو رہا تھا۔

اقبالؔ کے زمانے میں ہی جوشؔ ملیح آبادی نے قومی تحریک سے ترغیب پا کر ملک کے سماجی اور سیاسی مسئلوں پر نظم گوئی کی ابتدا کر دی تھی۔ اپنے مخصوص انداز اور انقلابی لہجے نے جوشؔ کو مقبولیت عطا کی۔ جوشؔ کے ہم عصروں میں فراقؔ نے مختصر تعداد میں نظمیں کہیں لیکن اُن کی اِمیجری Imagery اور انگریزی نظموں کے فنّی لوازمات کی وجہ سے فراقؔ اپنی بہترین غزل گوئی کے باوجود نظم کے بھی اہم شاعر ہیں۔ اُن کی طویل نظمیں ـــــ 'آدھی رات'، 'جگنو' اور 'ہنڈولہ' اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اُسی زمانے میں اخترؔ شیرانی نے رومانی نظم گوئی کی طرف توجہ کی۔ غزل زدہ ماحول میں اخترؔ شیرانی ایسے پہلے شاعروں میں ہیں جنھوں نے نظم پر خود کو مرتکز رکھا۔ انھیں شاعرِ رومان کہا گیا۔ مغربی نظم کی مختلف ہیئتوں کو اردو میں متواتر استعمال کر کے اخترؔ شیرانی نے نظم گوئی کا ایک نیا باب قائم کیا۔ خاص طور پر سانٹ کے بہترین نمونے اخترؔ شیرانی کے یہاں ملتے ہیں۔ انگریزی میں رومانیت کے حوالے سے یادِ ماضی، سوز و غم، زندگی سے فرار اور احساسِ جمال کے ملے جلے موضوعات اہم رہے ہیں جنھیں اخترؔ شیرانی کی نظموں میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے بزرگ ہم عصروں میں عظیم الدین احمد نے بھی صنفِ نظم کے تعلق سے اچھے خاصے تجربے کیے اور سلسلۂ خیال اور

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

موضوعاتی ارتکاز کو دھیان میں رکھتے ہوئے نظمیں کہیں۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "گلِ نغمہ" کلیم الدین احمد کے پیش لفظ کی وجہ سے زیرِ بحث رہا لیکن بدقسمتی سے ان کی نظمیں زیادہ مقبول نہیں ہوسکیں۔ اقبالؔ اور ترقی پسند شاعری کے درمیان مذکورہ چار شعرا ایک پُل کا کام کررہے ہیں۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ جہاں شعروادب کی بنیادی زمین میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہیں اردو نظم نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ ترقی پسندوں کے مجموعی سرمائے کا محاسبہ کیا جائے تو یہ کہنا صدفی صد صحیح ہوگا کہ اردو نظم ایک نئے معاشرے میں چلی آئی۔ حالیؔ سے لے کر اقبالؔ تک نظم گوئی کا جو سلسلہ تھا، وہ ترقی پسند شعرا کے یہاں بدل گیا۔ اسی زمانے میں آزاد نظم اور نظمِ معریٰ کی سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ نظمیں مقبول بھی ہونے لگیں۔ ترقی پسندی کے آغاز کے دور میں جذباتیت کی وجہ سے جب کسی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ غزل جاگیردارانہ معاشرے کی پروردہ ہے تو غزل گو شعرا ایک سلسلے سے نظمیں کہنے لگے۔ کئی شاعروں نے اپنی غزلوں پر بے وجہ عنوان لگا کر انھیں نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی۔ فیض احمد فیضؔ، مخدوم محی الدین، مجازؔ، علی سردار جعفری، جمیلؔ مظہری، جاں نثار اخترؔ، کیفیؔ اعظمی، وامقؔ جونپوری، سکندر علی وجدؔ ایسے شعرا ہیں جنھوں نے ترقی پسند نظم گوئی کو بلندی عطا کی۔ انھی شعرا کی کوششوں سے اردو کی ادبی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا جب غزل گوئی کے مقابلے میں نظم نگاری زیادہ آب وتاب کے ساتھ سامنے آئی۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے ملک گیر سطح پر کوئی واضح سرگرمی نہیں دکھائی لیکن چند شعرا نے اردو میں نظم کے نئے تصور کو قائم کرنے میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ ابتدائی زمانے میں چلنے والے لوگوں نے ایک ایسی نظم کا خاکا اپنے سامنے رکھا جس میں زندگی کے انفرادی معاملات بھی توجہ کے ساتھ شامل کیے جاسکیں۔ یہ کہنا غیر مناسب ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا کا سماجی نقطۂ نظر محدود یا غیر سماجی تھا۔ اُس زمانے میں 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کا غیر ضروری تنازعہ بھی زوروں پر تھا۔ اس لیے سہل پسندی میں لوگوں نے یہ مفروضہ بنالیا کہ ترقی پسند 'ادب برائے زندگی' کے علم بردار ہیں اور حلقۂ اربابِ ذوق کے لوگ 'ادب برائے ادب' کے قائل ہیں۔ کم سے کم اخترؔ الایمان کی شاعری یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ غمِ ذات سے غمِ کائنات تک کا سفر کتنی سرعت کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم شعرا میں ن۔ م۔ راشدؔ، میراجیؔ، قیوم نظرؔ اور مجید امجدؔ کی شاعری اردو نظم کے بہترین دور سے عبارت ہے۔ خاص طور پر راشدؔ، میراجیؔ اور اخترؔ الایمان جدید اردو نظم کے ایسے مثلث ہیں جن کے شاعرانہ کمالات پر غور کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان شعرا نے ہیئت کے اچھے خاصے تجربے کیے۔ حالاں کہ آزاد اور معریٰ نظم میں ان کے تجربے زیادہ کامیاب ہوئے۔ موضوع کو وسیع تناظر میں دیکھنا اور انسان کو اس کے اکیلے پن میں پہچاننا، دونوں پہلوؤں کو ان شعرا نے اپنی نگاہ میں رکھا۔ کہنے کو ترقی پسندوں کے ردِّعمل میں حلقۂ اربابِ ذوق قائم ہوا لیکن نظم کے ارتقا کو پیمانہ بنائیں تو نئی نظم کا یہ زمانہ عہدِ زرّیں ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے 'سوغات' کا جدید نظم نمبر شائع کیا جسے اب بھی اردو نظم گوئی کا سب سے جامع انتخاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب اردو نظم کے بہترین دور کی یادگار ہے۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

جدیدیت کے زمانے میں جس نئی نظم کا خاکا کھینچا گیا، وہ حلقۂ اربابِ ذوق سے ملتا جلتا تھا لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ زندگی کے تقاضے بدل رہے تھے۔ 1960 کے بعد اس نئی نظم کا ترقی پسند شعرا سے مقابلہ بھی نہیں تھا۔ خلیل الرحمان اعظمی، ابنِ انشا، منیر نیازی جیسے شعرا نے جس نئی نظم کے خدوخال طے کیے، وہ نہ صرف ترقی پسند نظم سے الگ تھا بلکہ حلقۂ اربابِ ذوق کی نظم سے بھی اس کی ڈگر علاحدہ تھی۔ اس زمانے میں عام طور پر نظمِ معرّیٰ ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ آزاد نظم اور پھر نثری نظم کے امکانات روشن ہونا شروع ہوئے۔ جدیدیوں کے زمانے میں نثری نظم کو علاحدہ صنف کی حیثیت سے جگہ ملی۔ بدلتی ہوئی زندگی پر جدیدیوں نے توجہ کی۔ نفسیاتی حقائق اور داخل کے شور کو پہلی بار پورے بھروسے کے ساتھ اس زمانے میں نظم گوئی میں جگہ ملی۔ وزیر آغا، شہریار، افتخار عارف، محمد علوی، ندا فاضلی، قاضی سلیم، باقر مہدی کو نظم نگار کی حیثیت سے اس عہد میں شناخت حاصل ہوئی۔ شاعرات کا ایک بڑا قافلہ بھی جدیدیت کے زمانے میں سامنے آیا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ تقریباً تمام جدید شعرا نے نظم گوئی کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھا اور خاصی تعداد میں نظمیں کہیں۔ ان شاعروں کی تعداد بھی بڑھنے لگی جنھوں نے نثری نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اردو کے موجودہ ادبی منظرنامے پر اکثر جدید شعرا سرگرم ہیں اور دورِ حاضر کی نظم گوئی، چند ایک نئے اور کم عمر شعرا کی نظم گوئی کو چھوڑ کر انھیں شاعروں کی مرہونِ منت ہے۔

نظم کی طویل تاریخ کے باوجود اردو شاعری کی مرکزی صنف غزل سے اس کا مقابلہ رہا۔ غزل کے سامنے کسی دوسری صنف کا چراغ نہیں جل سکا۔ نظم کے ارتقا کے مختلف مراحل پر توجہ دیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ نظم کی رفتار کئی بار سُست پڑی یا وہ معدوم ہوئی۔ تواتر کے ساتھ بیسویں صدی سے پہلے اس صنف کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ البتہ بیسویں صدی میں کئی ایسے شعرا سامنے آئے جنھوں نے نظم گوئی کو اپنا اصل میدان بنایا۔ کئی شعرا نے تو ایک بھی غزل نہیں کہی۔ اس وجہ سے بیسویں صدی میں نظموں کی طرف رجحان بڑھا۔ اقبال، اختر الایمان، راشد، میراجی، فیض، منیب الرحمان، سردار جعفری، محمد علوی، شہریار، ندا فاضلی، قاضی سلیم، علیم اللہ حالی، عین رشید جیسے نظم نگاروں کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اردو نظم روبہ ترقی ہے لیکن یہاں بھی جب غزل سے موازنہ ہوتا ہے تو بیسویں صدی کے غزل گو شعرا کی فہرست زیادہ طویل اور معتبر دکھائی دیتی ہے۔ ترقی پسندوں کے بعد نظمِ معرّیٰ کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ آزاد نظم اکثر جدید شعرا کے یہاں موجود ہے لیکن سب سے زیادہ نثری نظموں کی طرف نئے شعرا کا رجحان ہوا۔ سہل پسندی میں شعرا نثر اور نظم کے بنیادی امتیازات کو سمجھنے میں اکثر ناکام ہوتے ہیں جس کے سبب ان کی نظمیں اچھی نثر بھی نہیں بن پاتی ہیں۔ شاید ایسی ہی تخلیقات کی وجہ سے نثری نظم کے لکھنے والے دیگر شعرا یا قارئین وناقدین کی پھبتیاں برداشت کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں نظم کے روشن مستقبل پر اعتماد کرنا مشکل ہے۔

یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا نظم کی کوئی ضرورت ہے؟ غزل کے ماحول میں جب تجربہ اور تبدیلیاں بھی جاری ہیں، آخر صنفِ نظم کے استعمال یا تخلیق کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں نظم کی فنی تشکیل کو سامنے رکھنا ہوگا۔ غزل پر کلیم الدین احمد نے جو سخت اعتراضات کیے ہیں اور بار بار نظم سے موازنہ کر کے یہ بتانے کی انھوں نے کوشش کی ہے کہ نظم کی افادیت اور ادبی ضرورت کو قائم رہنا ہے۔ نظم میں کسی خیال کو ترتیب وار اس کے مختلف اجزا کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ یہاں مضمون نویسی

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

کے آداب یعنی ابتدا، ارتقا اور انجام کا دھیان رکھنا ہوتا ہے۔ غزل کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں اور وہاں خیال کا آخری نتیجہ پیش کرنا کافی ہوتا ہے۔ نظم کے مزاج کو بہ نظرِ توجہ دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کی شدید ضرورت اردو ادب کو ہے۔ مثنویاں، مراثی اور قصائد کے ختم ہونے کے بعد اردو شاعری میں کہاں کوئی ایسی صنف ہے کہ ضرورت پڑنے پر شاعر اپنے افکار کو ترتیب وار درج کر سکتا ہو۔ ہر شاعر کے ذہن میں، وہ فلسفی ہو یا نہ ہو، بعض خیالات موجود ہوتے ہیں جن کو وہ عوام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ پہلے قصیدے کی تشبیب میں یا مرثیے کے چہرے میں اور مثنویوں میں ایسے افکار کے لیے صنفی گنجائشیں تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد اردو کا شاعر اپنے مخصوص تصورات کو آخر کس شکل میں موزوں کرے؟

یہ ایک سچائی ہے کہ موجودہ دور میں دانش ورانہ فکر کے اظہار کے لیے نظم سے بہتر شاعری میں کوئی دوسری صنف موجود نہیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ ترقی پسندوں کے زمانے میں نظم کا زبردست فروغ ہوا۔ اختر الایمان کی نظموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس کچھ ایسی باتیں ہیں جو مختلف نظموں میں وہ کہہ رہے ہیں۔ وہ فلسفی نہیں اور ہر وقت فلسفیانہ گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتے لیکن اپنی دانش ورانہ فکر کو وہ عام کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں نظم کے علاوہ شاید ہی کوئی صنف استعمال میں لائی جا سکے۔ جیسے جیسے موضوعاتی اور سماجی پیچیدگیاں بڑھیں گی، نظموں کی طرف جھکاؤ بڑھنے کے مواقع آئیں گے۔ نظم کا ہر دور میں غزل سے مقابلہ رہے گا۔ جیسے غزل بے پناہ مخالفتوں کے باوجود قائم رہی، اسی طرح نظموں کا وجود بھی قائم رہے گا۔

مختصر گفتگو

۱۔ اردو میں نظمِ جدید کے بانی کے طور پر کس کی شناخت ہے؟

۲۔ قلی قطب شاہ اور فائز کے یہاں کس طرح کی نظمیں ملتی ہیں؟

۳۔ سانٹ (Sonnet) اور نظمِ معرّیٰ کے لیے کس کی شہرت ہے؟ چکبست کی نظموں کی عمومی ہیئت کیا ہے؟

۴۔ پانچ ترقی پسند نظم گو شعرا کے نام لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ نظم جدید کے ارتقا میں انجمنِ پنجاب کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ نظم گوئی میں نظیر اکبر آبادی نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟

۳۔ ''اقبال کی نظم گوئی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔'' اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔

۴۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے نظم گوئی کے میدان میں کون سی خدمات انجام دیں، بتائیے۔

۵۔ نظم گوئی کی موجودہ سمت و رفتار کا جائزہ لیجیے۔

۶۔ اردو کے پانچ نظم نگاروں کی پانچ پانچ نظموں کے عنوانات لکھیے۔

۷۔ آپ کو نظم نگار کے طور پر کون سا شاعر پسند ہے؟ بتائیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...